مولانا مودودی کی کتاب

"اسلام اور ضبطِ ولادت" پر ایک نظر

پروفیسر ابو شہاب رفیع اللہ

["اسلام اور ضبطِ ولادت" کے خلاف شرعی دلائل کا جواب پہلی قسط میں دیا گیا ہے۔ مدیر]

اہل مغرب کے اقوال

اب فاضل مصنف کی اصل پونجی یعنی اہل مغرب کے مخالف اقوال کی حیثیت ملاحظہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے ان کو جمع کرتے وقت تحقیق سے کام نہیں لیا کیونکہ ان میں سے اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے نقیض ہیں، ان کا پہلا اعتراض ملاحظہ ہو:-

۱۔ کثرت طلاق

صفحہ ۳۸ پر فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے طلاق کا رواج کثرت سے پھیل جاتا ہے۔ اس کی تائید میں فاضل مصنف نے کوئی پانچ صفحات پر مشتمل اقوال نقل کئے ہیں جن کا ایک ابتدائی ٹکڑا ملاحظہ ہو:-

"عورت اور مرد کے درمیان زوجی تعلق کو مضبوط کرنے میں اولاد کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ جب اولاد نہ ہوگی تو زوجین کے لئے ایک دوسرے کو چھوڑ دینا بہت آسان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں طلاق کا رواج کثرت سے پھیل رہا ہے اور طلاق حاصل کرنے والوں میں بڑی اکثریت ان جوڑوں کی پائی جاتی ہے جو بے اولاد ہیں۔ کچھ عرصہ قبل لندن کی ایک عدالتِ طلاق میں ڈیڑھ منٹ کے اندر ۱۵ نکاح فسخ کرائے گئے اور بلا استثناء وہ سب کے سب ایسے جوڑے تھے، جن کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔"

معلوم نہیں فاضل مصنف کو دنیا کے کس اہل علم یا بے علم نے یہ بتایا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کا مقصد بے اولاد کرنا ہے۔ اس کا مفہوم تو جیسا کہ اس کی اصطلاح سے ظاہر ہو رہا ہے، یہ ہے کہ خاندان میں بچوں کی تعداد اس حد تک محدود ہو کہ خوش اسلوبی سے خاندان کے ذرائع کے مطابق ان کی پرورش و تعلیم و تربیت کی جا سکے۔ اور دوسرے یہ کہ ماں اور بچّہ کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے ان کے درمیان مناسب وقفہ ہو۔ الازہر یونیورسٹی کے سابق ریکٹر شیخ محمود شلتوت کی تحقیق کے مطابق اسلامی تعلیمات تین سال کے وقفہ کا تقاضا کرتی ہیں۔ اب جب یہ چھوٹا یونٹ یعنی خاندان خوشحال و صحت مند ہوگا تو بڑا یونٹ یعنی ملک خود بخود خوش حال ہوگا۔ بلکہ اس کے پروگرام میں تو یہ بھی شامل ہے کہ جو جوڑے بے اولاد ہیں مناسب علاج معالجہ سے ان کی

گودیں شاداب کی جائیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کی اس اصل تشریح کو سامنے رکھا جائے تو فاضل مصنف کا اعتراض بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے۔

(۲) طبقات کا عدم توازن

فاضل مصنف جس دوسرے اعتراض کو سب سے نمایاں کر رہے ہیں، ان کے الفاظ ہیں وہ یہ ہے کہ ضبط ولادت پر عمل کرنے والی سوسائٹی میں جسمانی محنت کرنے والے طبقے بڑھ رہے ہیں اور ان لوگوں کی تعداد روز بروز گھٹتی چلی جا رہی ہے جو عقلی اور ذہنی مرتبے کے لحاظ سے بلند درجہ رکھتے ہیں جن میں کار فرمائی و رہنمائی کی صلاحیت ہے۔ یہ چیز آخر کار ایک قوم کے زوال کی موجب ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا لازمی نتیجہ قحط الرّجال ہے اور قحط الرّجال کے بعد کوئی قوم دنیا میں سربلند نہیں رہ سکتی (ص ۴۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کسی مجبوری کی بناء پر اس غیر اسلامی نقطہ نظر کا سہارا لے رہے ہیں۔ کیونکہ اسی کتاب میں چند صفحات بعد اس اصول کے خلاف دلائل لا کر خود اس کی دھجیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ درجہ اوّل کے انسان تو ہمیشہ غریب والدین یعنی جسمانی محنت کرنے والے طبقوں میں ہی پیدا ہوا کرتے ہیں۔ انہی کی زبانی سنیئے۔ صفحہ ۱۲۸ پر فرماتے ہیں :-

"مگر تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسی تعلیم و تربیت کے ساتھ تم صرف تیسرے درجہ کے حیوانات پیدا کر سکتے ہو۔ یا زیادہ سے زیادہ دوسرے درجہ کے۔ درجہ اوّل کے انسان تمہاری نسلوں میں کبھی نہ اٹھیں گے۔ یقین نہ آئے تو دنیا کی تاریخ اور اکابر رجال کے سوانح اٹھا کر دیکھ لو۔ تم کو درجہ اول کے جتنے آدمی ملیں گے ان میں سے کم از کم ۹۰ فیصدی ایسے ہوں گے جو مفلس و نادار ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئے۔ مصیبت کی آغوش میں پرورش پا کر اٹھے، تمناؤں کے خون اور خواہشات کی قربانی کے ساتھ جوانی بسر کی۔ زندگی کے سمندر میں بغیر کسی ساز و سامان کے پھینک دیئے گئے۔ موجوں سے تیرنا سیکھا، تھپیڑوں سے بڑھنے کا سبق حاصل کیا اور آخر کار ساحلِ کامرانی پر اپنی برتری کا جھنڈا نصب کر کے چھوڑا۔"

مالتھوس سے غلط استدلال

صفحہ ۱۳ پر فرماتے ہیں کہ اس کا پہلا محرک غالباً انگلستان کا مشہور ماہر معاشیات مالتھوس (MALTHUS) تھا جس نے آبادی کی توفیر دیکھ کر یہ حساب لگایا تھا کہ زمین پر قابل سکونت جگہ محدود ہے۔ اور اسی طرح معیشت کے وسائل بھی محدود ہیں۔ لیکن نسل کی افزائش غیر محدود ہے۔ اگر نسل اپنی فطری رفتار کے ساتھ بڑھتی رہے تو زمین اس کے لئے تنگ

ہو جائے گی۔ وسائل معاش کفایت نہ کر سکیں گے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے کہیں سے مالتھوس کے رسالے کے پہلے ایڈیشن کے اقتباسات پڑھے ہیں، جن کا وہ بڑے فخر سے توڑ پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ مالتھوس نے تو اپنے اسی رسالہ کے دوسرے ہی ایڈیشن میں ان خیالات کو پیش کر دیا تھا جو فاضل مصنف ان کے ردّ میں پیش کر رہے ہیں۔ پروفیسر تھامپسن نے مسائل آبادی میں مالتھوس کے رسالے کے دوسرے ایڈیشن سے جو اقتباسات پیش کئے ہیں ان میں سے ایک دو ملاحظہ ہوں صفحہ ۲۵ پر فرماتے ہیں" کہ امریکہ کے اس وقت کے معاشی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مالتھوس نے یہ کہا تھا کہ انسان آبادی کے اضافے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے ذرائع معاش میں اضافہ کر سکتا ہے۔" پھر اسی کتاب کے صفحہ ۳۷ پر یہ الفاظ ہیں" یہ اضافہ ہوا بھی ہے اور آئندہ بھی ہو سکتا ہے لیکن دنیا کے اکثر ممالک میں عملاً یہ ہو رہا ہے کہ انسان جس رفتار سے اپنی تعداد بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے، اتنی کوشش اس نے ذرائع معاش بڑھانے میں صرف نہیں کی۔" ہمارے فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں بیسیوں جگہ پروفیسر تھامپسن کی کتاب "مسائل آبادی" کا حوالہ دیا ہے۔ اب انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر وہ مالتھوس کے نقطۂ نظر پر عالمانہ بحث فرمانا چاہتے تھے تو کم ازکم اس کے صحیح نقطۂ نظر کو نقل کر کے بحث فرماتے۔ مالتھوس کا جو نقطۂ نظر ہم نے اس کے رسالے کے دوسرے ایڈیشن سے نقل کیا ہے دنیا کے حقیقی واقعات اب بھی اس کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

۴۔ بوڑھوں کے تناسب میں اضافہ فاضل مصنف کا ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے سے پیدا آور آبادی میں کمی اور بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے جو کسی ملک کی معاشی ترقی کے لئے نقصان دہ ہے۔ صفحہ ۳۱ پر فرماتے ہیں :۔

"معیشت کی صحت مند بنیادوں پر ترقی کے لئے ضروری ہے کہ بوڑھوں اور جوانوں میں ایک خاص تناسب قائم رہے تاکہ تمدن کی گاڑی کھینچنے والے مضبوط ہاتھ کبھی کمزور نہ پڑنے پائیں۔ قدرت نے اس کا پورا پورا بندوبست کیا ہے۔ لیکن ضبط ولادت کی وجہ سے قدرت کے کام میں جو مداخلت کی جاتی ہے اس کی بدولت یہ فطری توازن بگڑ جاتا ہے۔ بوڑھوں کی تعداد تو برابر بڑھتی رہتی ہے لیکن بچوں میں مناسب رفتار سے اضافہ نہیں ہو سکتا اور تناسب برابر ناموافق ہوتا جاتا ہے۔ اس کا آخری نتیجہ کارکنوں کی قلت اور قومی طاقت کا زوال اور معاشی قوت کی کمی ہے۔"

یہاں تو یہ فرمایا ہے کہ بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ معیشت کی صحت مند بنیادوں کے منافی ہے لیکن چند ہی صفحات بعد بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ کو معاشی ترقی کا ایک اہم عنصر قرار دیتے ہیں یعنی جس چیز کو یہاں قدرت کے کام میں مداخلت قرار دیا ہے، اب وہ عین قدرت کے مطابق بن جاتا ہے۔

انہی کے الفاظ میں سنئے صفحہ ۹۶ پر معاشی نقصان کے ذیل میں فرماتے ہیں :۔

"شرح پیدائش کے گھٹنے سے پیدا آور آبادی (PRODUCING POPULATION) کے مقابلے میں خرچ کرنے والی آبادی (CONSUMING POPULATION) کم ہو جاتی ہے اور اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پیدا آور آبادی میں بے کاری بڑھتی چلی جائے۔ پیدا آور آبادی صرف جوانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ برعکس اس کے خرچ کرنے والی آبادی میں بوڑھے، بچے اور معذور لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جن کا پیداوار میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اگر ان کی تعداد گھٹ جائے تو مجموعی طور پر خرچ کرنے والوں میں بھی کمی واقع ہوگی۔ مال کے خریدار کم ہو جائیں گے تو اسی نسبت سے مال تیار کرنے والوں کو کم کام ملے گا۔ فاضل مصنف کے دلائل ملاحظہ ہوں کہ بوڑھوں کا اضافہ جو صفحہ ۱۳ پر زحمت تھا، صفحہ ۹۶ پر رحمت بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں صرف مخالف اقوال جمع کرنے سے کام ہے۔ چاہے وہ ایک دوسرے کی ضد ہی کیوں نہ ہوں۔

ہم نے یہ تفصیل صرف فاضل مصنف کی تضاد بیانی کے لئے نقل کی ہے۔ ورنہ انھوں نے تھامپسن کی کتاب "مسائل آبادی" سے جو اعداد و شمار نقل کئے ہیں، ان کا کسی طور خاندانی منصوبہ بندی سے ادنیٰ تعلق بھی نہیں بنتا اور وہ جس نقطہ یعنی پیدا آور آبادی میں کمی کو ان اعداد و شمار سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ الٹا ان کے مقصد کے خلاف جاتے ہیں کیونکہ ان سے تو پیدا آور آبادی میں اضافہ ثابت ہوتا ہے لیکن فاضل مصنف نے بڑی ہوشیاری سے ایسے تمام اعداد و شمار اپنے نقشہ سے خارج کر دیئے ہیں۔ شائد انھوں نے سوچا ہو گا کہ کون اصل کتاب کو دیکھنے کی زحمت گوارا کرے گا۔ جن اعداد و شمار کو فاضل مصنف نے ہوشیاری سے اڑا دیا ہے، یعنی پیدا آور آبادی کا اہم طبقہ جن کی عمر تیس اور چالیس سال کے درمیان ہوتی ہے، اس کے اعداد و شمار یوں ہیں :۔

	۱۸۸۰ء میں تناسب	۱۹۵۰ء میں تناسب
انگلستان اور ویلز	۱۲ء۷	۱۴ء۷
فرانس	۱۳ء۸	۱۴ء۸
امریکہ	۱۲ء۷	۱۵ء۱

اب دیکھئے کہ جس نقشہ کا سہارا لیا جا رہا ہے، اسی سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے سے پیدا آور آبادی میں اضافہ ہوا ہے تو ان کے اعتراض کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

۵۔ زنا میں اضافہ | صفحہ ۳۲ پر فرماتے ہیں کہ "ضبط ولادت نے جدید دنیا کی اجتماعی زندگی میں گناہ کا جو دروازہ کھولا ہے، اس سے زنا، جنسی جرائم اور امراض خبیثہ کے عفریت

دندناتے ہوئے داخل ہو رہے ہیں۔ اس کی تائید میں جو اقوال نقل کئے ہیں، ان کی ایک جھلک ملاحظہ ہو :۔

" انگلستان کا حال یہ ہے کہ ہر سال وہاں ۸۰ ہزار سے زیادہ ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ڈیوسیزان کانفرنس کی رپورٹ کی رُو سے ۱۹۴۶ء میں ہر آٹھ میں سے ایک بچہ ناجائز تھا اور ہر سال تقریباً ایک لاکھ عورتیں دائرہ نکاح سے باہر حاملہ ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر آزوالڈ سوارز لکھتا ہے۔ ہر سال اوسطاً ۸ ہزار عورتیں ناجائز اولاد کو جنم دیتی ہیں (یعنی تمام زچگیوں کا ۳/۱)

مغرب میں ناجائز اولاد کے متعلق فاضل مصنف نے جو اعداد و شمار دیئے ہیں، معلوم نہیں، ان کا خاندانی منصوبہ بندی سے کیا تعلق ہے۔ کیونکہ اگر یہ بُری عورتیں ضبطِ ولادت کے طریقوں پر عمل کرتیں تو پھر تمام زچگیوں کا ۳/۱ حصّہ کبھی بھی ناجائز اولاد نہ ہوتی۔ ۳/۱ حصّہ تو کجا۔ ۱۰۰/۱ حصّہ بھی نہ ہوتیں۔ اور چیزیں تو چھوڑیئے اب تو وہاں اسقاط حمل کے ایسے بے ضرر طریقے ایجاد ہو چکے ہیں، جو بچے جننے سے کئی درجہ کم تکلیف دہ اور کم خطرناک ہیں۔ دراصل ناجائز اولاد مغربی معاشرہ میں ویسی بُرائی نہیں سمجھی جاتی، جیساکہ ہمارے معاشرہ میں۔ ہمارے ہاں ناجائز حمل کی اوّل تو پیدائش تک نوبت ہی نہیں آنے دی جاتی یا اسے پیدا ہوتے ہی ختم کر دیا جاتا ہے اصل میں ہمارے ہاں کی مشرقی قدریں بھی عجیب ہیں۔ ۹۹ فی صدی جنسی جرائم میں پہل مَردوں کی طرف سے ہوتی ہے لیکن مجرم ہمیشہ عورتوں ہی کو گردانا جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ مرد اگر ساری عمر اس قسم کی برائیاں کرتا رہے تو اسے اس جرم کی پاداش میں کبھی سوسائٹی سے باہر نہیں کیا گیا۔ لیکن اگر کوئی بدنصیب عورت کسی مرد کی حیوانیت کا شکار ہو جائے اور اس میں اس کا رتی بھر قصور نہ ہو تو اسے طرح طرح سے ذلیل کیا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسے شادی میں قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

مغرب کے ان اعداد و شمار کا اس اعتراض سے تو خیر کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا، ہمارے خیال میں اس اعتراض کا مولانا ابوالکلام آزاد نے جو جواب دیا ہے، وہ کافی سے زیادہ ہے۔ برصغیر میں جب خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کی ابتدا ہوئی تو انھوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا (ملاحظہ ہو ماہنامہ الحکیم، لاہور نومبر ۱۹۳۹ صفحہ ۱۲۹) تو ان کے سامنے یہی زنا میں اضافے کے خدشے والا اعتراض کیا گیا۔ اس کا جو جواب مولانا نے دیا تھا وہ انہی کی زبانی سنئے :۔

" اخلاقی نقطۂ نگاہ سے صرف یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر برتھ کنٹرول کے طریقے عام ہو گئے تو غیر شادی

شدہ عورتوں کو جو اندیشہ ہوتا ہے، وہ جاتا رہے گا۔ لیکن یہ اعتراض چنداں وقیع معلوم نہیں ہوتا۔ جو بگڑنے والی ہوتی ہیں، وہ بگڑتی ہی ہیں محض اس اندیشہ کی دیوار پہ اخلاقی روک قائم نہیں رہ سکتی (الیضاً)

۶۔ زندگی میں کامیابی کے لئے کثرت اولاد کی شرط

صفحہ ۹۴ پر فرماتے ہیں :۔ پھر تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ خاندان زیادہ کامیاب ہیں جو کثیر الاولاد ہیں۔ کم اولاد رکھنے والے خاندان ان کے مقابلہ میں ناکام پائے گئے ہیں"۔

فاضل مصنف نے جگہ جگہ اہل مغرب کے بڑے بڑے اقوال نقل کئے، معلوم نہیں اس بارے میں وہ ان کی تازہ ترین تحقیق سے کیسے بے خبر ہیں۔ حکومت امریکہ کی طرف سے حال ہی میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے ایک تہائی قوم (ONE THIRD OF THE NATION) اس رپورٹ کا ایک حصّہ یوں ہے :۔

امریکہ کی اعلیٰ ملازمتوں (SELECTED SERVICES) کے لئے جن امیدواروں کو ذہنی طور پر نااہل قرار دے دیا گیا تھا، اس میں ستر فیصدی ایسے امیدوار تھے جن کے گھر میں چار یا اس سے زیادہ بچے تھے[۱۲]

اس کے برعکس فاضل مصنف کا فرمان ہے کہ بغیر کسی وقفہ کے بے تحاشا بچے پیدا کرتے جاؤ۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے!

۷۔ محط الرّجال

صفحہ ۹۳ پر فرماتے ہیں :۔

"تخلیق انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو زبردست انتظام کیا ہے، اس میں انسان کا حصہ بس اس قدر ہے کہ مرد اپنا نطفہ عورت کے جسم میں پہنچا دے ۔۔۔۔ ان جراثیم میں سے ہر ایک جداگانہ موروثی اور شخصی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ انہی میں کند ذہن اور احمق بھی ہوتے ہیں۔ اور عقلاء اور حکماء بھی۔ ان میں ارسطو اور ابن سینا بھی ہوتے ہیں۔ چنگیز اور نپولین بھی۔ شکسپیئر اور حافظ بھی۔ میر جعفر اور میر صادق بھی اور اخلاص و وفا کے پتلے بھی ۔۔۔۔ بہت ممکن ہے کہ ضبط ولادت پر عمل کرنے والا انسان اپنی قوم میں ایک بہترین جنرل یا مدبر یا حکیم کی پیدائش کا روک دینے کا سبب بن جائے" (صفحہ ۹۴)

جب کسی نے یہ کہہ دیا کہ اس کے برعکس احمق اور کند ذہن بھی تو ہو سکتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ایسا سوچنا صریح حماقت ہے کیونکہ ہمارے پاس اس کے معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ سنئے :۔ "یہ خیال اس وقت صحیح ہوتا جب انسان کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہوتا کہ کون سا بچہ کن خصوصیات کا حامل ہوگا؟ لائق ہوگا یا نالائق۔ زندہ رہے گا یا مر جائے۔ اس کا وجود کارآمد ہوگا یا بے کار؟ جب یہ چیز انسانی نظر سے قطعاً پوشیدہ

---

[۱۲] JOURNAL OF MARRIAGE & FAMILY NOVEMBER 1964, P 473

ہے تو محض رجماً بالغیب کوئی رائے قائم کرنا صریح حماقت ہے (۱۲۹)

۸۔ لذت پرستی | فاضل مصنف کا ایک اعتراض یہ ہے کہ ضبط ولادت پر عمل کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کریں مگر اس لذت کے ساتھ جو نتائج اور ذمہ داریاں فطرت نے مقرر کی ہیں، ان سے بچے رہیں۔ (صفحہ ۲۰) لیکن صفحہ ۸۶ پر یہ تحقیق پیش کرتے ہیں کہ اس پر عمل سے پوری لذت حاصل نہیں ہوتی۔ سنئے اور فاضل مصنف کی تحقیق کی داد دیجئے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہر مانع حمل طریقہ کے نفسیاتی اثرات بھی بڑے پیچیدہ ہیں اور ان کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ذہنی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں بلکہ جنسی فعل کی اس لذت کو بھی وہ خاک میں ملا دیتے ہیں . . . ." (صفحہ ۸۶) صفحہ ۸۰ پر اس پر ایک بند کا اور اضافہ کرتے ہیں۔ "البتہ اس بات کا ہمیشہ خطرہ ہے کہ مانع حمل وسائل کے استعمال سے جب مرد کو زوجی تعلق میں اپنی خواہشات کی پوری تسکین حاصل نہ ہوگی تو اس کی عائلی زندگی کی مسرّتیں غارت ہو جائیں گی اور وہ دوسرے ذرائع سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جو اس کی صحت کو برباد کر دیں گے اور ممکن ہے کہ اسے امراض خبیثہ میں مبتلا کر دے۔"

۹۔ قتلِ اولاد | کسی شخص کو اگر درخت کا ایک بیج ضائع کرنے پر ایک بڑے درخت یا باغ کے تباہ کرنے کے جرم میں پکڑ لیا جائے تو تمام دنیا اس الٹی منطق پر ہنسے گی لیکن فاضل مصنف اپنی کتاب میں اسی الٹی منطق کو اختیار کرتے ہوئے مادہ تولید کے ضائع کرنے کو اولاد قتل کرنے کے برابر قرار دے رہے ہیں۔ آیت ولا تقتلوا اولادکم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ معاشی مشکلات کے خوف سے اولاد کی تعداد گھٹانا محض ایک حماقت ہے (صفحہ ۹۹۔۱۰۰)

عزل یا ضبط ولادت کے دوسرے طریقوں میں مادہ منویہ کو ضائع کیا جاتا ہے۔ اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ بیوی سے ایک مباشرت میں ایسے کروڑوں جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اب اگر اس مادہ منویہ کو ضائع کرنا اولاد کا قتل کرنا ہے تو پھر حمل ٹھہر جانے کے بعد ہر شخص کے لئے بیوی سے مباشرت جائز نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اس طرح وہ اربوں "اولاد" کا قاتل تصور ہوگا۔ حالانکہ بات بڑی سیدھی سی ہے۔ عربی زبان میں ولد کا اطلاق ہی اس بچہ پر ہوتا ہے جو پیدا ہو چکا ہو۔ ہمارے علماء تو چار ماہ تک کے حمل کو بھی مادہ منویہ ہی میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ اصول کی کتابوں میں عزل کی تعریف یوں کی گئی ہے:۔

حکم العزل ھذا یجری علی استعمال دواءٍ لمنع الحمل موقتاً ویجری علی اسقاط النطفۃ قبل نفخ الروح فیھا فان الحکمۃ فی الکل واحدۃ وھی منع لحمل واللہ اعلم

(عزل کے حکم میں حمل روکنے کی دوا اور نفخ روح سے پہلے حمل کا گرا دینا بھی شامل ہے کیونکہ ان تمام میں ایک ہی حکمت ہے اور یہ حمل کا روکنا ہے۔ واللہ اعلم)[۱۳]

۱۰۔ خاندانی منصوبہ بندی اور دفاع

فاضل مصنف کا آخری اہم اعتراض یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ملک کا دفاع کمزور ہو جاتا ہے۔ اور اس کی تائید میں اور دلائل کے علاوہ ایک بہت ہی اہم اعتراض یہ نقل کیا ہے کہ جنگ عظیم ثانی میں فرانس کی شکست کا سبب اس کے جرنیل مارشل پیتاں، کی زبانی یہ ہے کہ فرانس کی شکست کا ایک بنیادی سبب قلّت اطفال (TOO FEW CHILDREN) تھا۔ (صفحہ ۸، ۱۷۰)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنّف کو فرانس کی شکست کے اسباب کا مطالعہ کرنے کا موقع تو نہیں مل سکا۔ کہیں سے جلدی میں مارشل پیتان کا مذکورہ بالا قول نقل کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانس نے اس جنگ میں جس بزدلی کا ثبوت دیا تھا، اس کا اندازہ تھامس کرنان کی "فرانس پر رپورٹ" (A RERORT ON FRANCE) کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "یہ اس قدر لرزا دینے والی داستان ہے کہ فرانسیسی عساکر کو کیسے ہی آلاتِ حرب سے مسلح کیوں نہ کر دیا جاتا کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ تو لڑنا ہی نہیں چاہتے تھے اور نہ لڑنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کی حالت بلی کے سامنے چوہے کی تھی" اس کے ساتھ ہی ۵ ستمبر ۱۹۳۹ء کے "ACTION" کے شمارے کے ان الفاظ کو دیکھئے" فرانس کیا کرے گا؟ میں پیغمبر تو نہیں ہوں کہ پیشین گوئی کروں۔ لیکن اندازہ لگا سکتا ہوں کہ وہ میگنیاٹ لائن میں بیٹھیں گے" (LAVIE PARISEINNE) کے تراشے کاٹیں گے۔ خندقوں میں بے مصرف لڑکیوں کو بلائیں گے اور پھر گھر جانا چاہیں گے[۱۴]

مارشل پیتان کا جس کے قلت اطفال والے قول کا بڑا سہارا لیا جاتا ہے، اپنا کردار ملاحظہ ہو کہ ۱۴ جون کو جرمن فوجیں پیرس میں داخل ہوتی ہیں اور ۱۷ جون کو مارشل پیتان ہتھیار ڈال کر صلح کی درخواست کرتے ہیں۔ گیا تین ہی دن میں فرانس کی ساری فوج ختم ہو چکی تھی۔ حالانکہ بعض مبصروں کا خیال تھا کہ پیتان کو اس وقت ہتھیار ڈالنے کی بجائے الجزائر میں جا کر علم بلند رکھنا چاہیئے تھا۔

---

[۱۳] کتاب التاج الجامع للاصول جلد ۲ صفحہ ۳۴۵۔ مطبوعہ مصر۔

[۱۴] تحدید نسل اور دفاع۔ محمد شریف ایم اے۔ صفحہ ۲۶

فاضل مصنف کی کتاب کے ساتھ ایک ضمیمہ ہے جس کے صفحہ ۱۷۶ پر دفاع کے سلسلے میں یہ فرمایا گیا ہے :-

خالص دفاعی نقطہ سے پاکستان کی حیثیت بتیس دانتوں کے درمیان ایک زبان کی سی ہے. ہمارے ملک کے ایک طرف ہندوستان ہے، جس کی آبادی ہم سے پانچ گنی زیادہ ہے اور جس سے ہمارے تعلقات مختلف وجوہ کی بنا پر بڑی نازک حالت میں ہیں۔ دوسری طرف روس ہے جو عالمی اشتراکیت کے فروغ کے لئے اپنی سیاسی اور فوجی قوت برابر استعمال کر رہا ہے۔ نیز جس کی آبادی ہم سے تین گنی زیادہ ہے. تیسری طرف چین ہے، جو ایشیا میں برابر اپنے دائرے کو وسیع کر رہا ہے اور جس کی آبادی ہم سے آٹھ گنا زیادہ ہے. ان تینوں کی نگاہیں ہمارے اوپر لگی ہوئی ہیں اور جس نظر سے یہ ہمیں دیکھ رہے ہیں، اسے اچھی نظر نہیں کہا جا سکتا۔"

علم سیاست سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ آج کل بین الاقوامی سیاست کا دار و مدار ہر ملک کے قومی تقاضوں پر ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد نہ مستقل دوستی پر ہے اور نہ مستقل دشمنی پر۔ قومی مفاد کا تقاضا ہو تو دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور دوستی دشمنی میں۔ ملک کے دفاع کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تک پہنچانے میں کسی کو انکار نہیں۔ آج کی دنیا میں اس کے لئے صلاحیت کار میں اضافہ کی ضرورت ہے نہ کہ صرف آبادی میں۔ اور اگر ہم جس طرح بھی اپنی آبادی بڑھانا چاہیں، مذکورہ بالا تینوں ممالک کی آبادی کی کسی طور برابری حاصل نہیں کر سکتے۔ ویسے جس آٹھ گنا آبادی والے ملک کا موہوم خطرہ انہیں چین نہیں لینے دیتا، نہ صرف یہ کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں بلکہ ہماری قومی زندگی کے مشکل ترین وقت میں وہ ہمارا بہترین دوست ثابت ہوا۔ اور تین گنا آبادی والے ملک سے تعلقات کی نوعیت دن بدن دوستانہ ہوتی جا رہی ہے۔

اس سلسلے میں اسرائیلی خطرے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے (صفحہ ۱۷۶)۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف اسی مثال کو ذرا گہری نظر سے دیکھ لیا جائے تو اس عنوان پر ان کے دلائل کا انبار بے کار سا نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس مثال سے تو صلاحیت کار کی فوقیت ظاہر ہوتی ہے نہ کہ محض تعداد کی۔ امریکہ میں یہود کی تعداد ۲ فیصد سے بھی کم ہے لیکن وہ اپنی اعلیٰ صلاحیت کار کی وجہ سے اس کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس اکثر ممالک میں مسلمانوں کی آبادی پندرہ اور بیس فی صد سے بھی زیادہ ہے لیکن ان کا ان ملکوں کی سیاست پر اثر انداز ہونا تو کجا وہاں باعزت زندگی تک گزارنا مشکل ہے۔ اقلیت والے ممالک کا تو ذکر کیا، افریقہ کے بہت سے نو آزاد ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن وہاں عیسائی جن کا تناسب بعض صورتوں میں پانچ فی صد بھی نہیں، اپنی صلاحیت کار کی وجہ سے وہاں چھائے ہوئے ہیں. خود عربوں کے مقابلے میں اسرائیل کی

آبادی دو فی صد سے کم ہے، لیکن یہ پچاس گنا کمی اس کے دفاع پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔

مسئلہ کا حل

کتاب کے آخر میں اس مسئلہ کا حل یہ بتایا گیا ہے:۔

"ہماری نگاہ میں مسئلہ کا اصل حل پیداوار کو بڑھانے اور معیشت کو ترقی دینے میں ہے" (صفحہ ۱۹۸)

پیداوار کو بڑھانے اور معیشت کو ترقی دینے کے بارے میں پاکستان میں جو کوششیں ہو رہی ہیں، عالمی ماہرین تک کا یہ تاثر ہے کہ اس سلسلے میں پاکستان اپنے جیسے دوسرے ممالک پر بازی لے گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود خوراک کی ایک کثیر مقدار باہر سے درآمد کی جا رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں امریکہ کے عالمی ادارے کی طرف سے تین جلدوں (۲۳۱۴ صفحات) پر مشتمل ایک اہم کتاب شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے:۔

ASIAN DRAMA, AN INQUIRY INTO THE POVERTY OF NATIONS.

اس کتاب میں ہندوستان، پاکستان اور انڈونیشیا کے معاشی حالات کا تجزیہ کر کے یہ رائے دی گئی ہے۔ ان ممالک کو بڑے بڑے کام خود سرانجام دینے چاہئیں۔ ان بڑے بڑے کاموں میں سے ایک اہم کام زراعت کی ترقی ہے، جس کے لئے دوسرے اقدامات کے علاوہ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ہر مالکِ زمین اپنی زمین میں خود کاشت کرے یا زراعت کو پیشہ بنا کر ذاتی طور پر اس کا انتظام کرے۔ جس کے لئے بٹائی کا سسٹم ختم کرنا پڑے گا[15]۔ آج کے ماہرین معاشیات زراعت کی ترقی کے لئے جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، شریعت اسلامیہ نے آج سے چودہ سو سال پہلے عین یہی تعلیم دی تھی۔ ایک دو فرمودات نبوی ملاحظہ ہوں۔ طوالت سے بچنے کے لئے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں روایتیں سنن ابی داؤد کی کتاب البیوع جلد دوم سے لی گئی ہیں۔ اور صاحب سنن کی تحقیق کے مطابق صحیح ہیں۔ (۱) حضرت جابر بن عبداللہ (انصاری) کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو بٹائی کا کام ترک نہیں کرتا، وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ (۲) ابن ابی نعیم، حضرت رافع بن خدیج انصاری کا بیان کردہ واقعہ یوں دہراتے ہیں کہ رافع نے ایک زمین پر کاشت کی۔ وہ اس کی آبیاری کر رہے تھے کہ حضور صلعم کا ادھر سے گزر ہوا۔ پوچھا کہ یہ کھیتی کس کی ہے اور یہ زمین کس کی ہے؟ رافع نے کہا میری یہ کھیتی میرے بیج اور میری ہی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا (جس کی یہ زمین)۔ حضورؐ نے فرمایا۔ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ لہذا

---

[15] پاکستان ٹائمز مورخہ ۶۷/۳/۷ صفحہ ۷